جانِ غالب

دل کے بہلانے کو ڈالے ڈاک میں
ان کی جانب سے خط اپنے نام کے

جانِ غالب!

(انتخاب و شرح دیوان غالب)

انعام اللہ خاں ناصر

ناشران
ج کمپنی لمیٹڈ۔ قرآن منزل۔ ریلوے روڈ۔ لاہور

مکتوب پہلا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

جانِ غالب

جلوہ فرمائی کا شکر ادا نہ کروں تو کافر۔ چہرہ کشائی کا احسان نہ مانوں تو گنہگار۔ دیدار میسر ہوا۔ تجلی نظر آئی۔

ملاقات ہوئی آنکھیں دولتِ جمال سے بہرہ یاب ہوئیں۔ لیکن نہ اس ملاقات سے تسلی ہوئی نہ اس دیدار سے تسلی ع

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا؟

نہ دید کے بعد بازدید کی نوبت پہنچی نہ زبانِ تمنا کو گذارشِ احوال کا موقعہ ملا مثل ہے کہ ٹک جیئے تو کیا جیئے۔

روضۂ رضوان کا دروازہ کھلا اور چشم زدن میں بند ہو گیا۔ خورشید آسمانِ جمال یکایک سامنے آیا اور دوسری نگاہ کے پہنچنے تک غائب ہو گیا۔ حیران ہوں کہ اس جمال دلفروز نے بایں ہمہ نظارہ سوزی مستور رہنا کیوں ضروری سمجھا۔ اس برقِ حسن نے جو خود ہی مشتاق نگاہوں کو خیرہ کرنے والی

تھی اس رسم عامیانہ کی پیروی کیوں کی۔

اس صورت زیبا اور طبیعت جہاں آرا کے نظارہ سے پہلے میں کہا کرتا تھا

مُنہ نہ کُھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زُلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے مُنہ پر کُھلا

ایک حسرت تھی۔ پپیہے کی طرح دریا کے کنارے پہنچنے کی۔ ایک آرزو تھی گُنہگار کے مانند بخشے جانے کی نہیں جانتا تھا کہ یہ تمنا جیتے جی بر آئیگی نہیں سمجھتا تھا کہ میری التجا کبھی قبول کی جائیگی اور حسن کے لُطف و کرم کا دریا جوش اور بخت خوابیدہ ہوش میں آیا۔ نظر جلوۂ منتظر سے شادکام ہوئی روز سیاہ فراق کی شادکام ہوئی ہو لیکن اس شان سے کہ

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

دل اس جلوۂ ہوشربا کے مسحور کن اثرات سے سنبھلا تو مرزا اسداللہ خاں مرحوم کا یہ شعر بے اختیار زبان پر آیا

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

پھر وہی حضرتِ دل وہی نالہائے سینہ گداز۔ وہی مایوس نظریں وہی تاریکی شبہائے درازِ عشق جو قناعت کا دُشمن اور طلب مزید کا خوگر ہے۔ حسن کی اس نوازش سے تسلّی نہ ہوا جرعہ آب سرد سے لب سوختۂ سموم کی پیاس نہ

بجھی۔ ابرِ بہار کا ایک چھینٹا اجڑے چمن کو سرسبز نہ کر سکا۔ سورج کی پہلی کرن میرے گوشۂ تاریک کو نہ جگمگا سکی۔ شبنم کی بوند جھلسے ہوئے سبزہ کی تشنگی فرو نہ کر سکی۔

نسیم کا ایک رُوح پرور جھونکا تھا جو بلبلِ اسیر کے پاس سے گذر گیا۔ کامیابی کا خیال تھا جو کسی حرماں نصیب کے دماغ میں نمودار ہونے کے بعد یاس کی تاریکی میں غائب ہو گیا۔

اب دوا کی شکایت اس لئے بیجا ہے کہ وہ دِل تو گئی اور درد کا شکوہ یُوں ناروا ہے وہ ایک لمحہ ساکن تو رہا ؎

بر من جفا ز بخت بد آمد وگرنہ یار
حاشا کہ رسم جور و طریق ستم نہ داشت

آرزومند ہوں تو اپنے بخت ناروا سے کہ اس نے خوابِ دل آویز کو جلد ختم کر دیا آہ۔ امید کی سر بفلک عمارت نقش بر آب نکلی اور تمنّا کی بہار آفرینی جلوہ سراب وہ شکل دلفریب اس سے پہلے کہ اس کا عکس آنکھوں سے اُتر کر دل تک پہنچے، امید موہوم کی طرح ایک جھلک دکھا کر غائب ہو گئی

ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پہ مرنا
ستمگر تیرا آنا تھا مگر تمہید جانے کی

آنے کی اس شان کے صدقے جانے کے اس انداز پر نثار۔ بہارِ نَو کی طرح آنا اور ساعتِ عیش کی طرح گذر جانا

لیتے ہی دل جو عاشقِ دلسوز کا چلے   تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے
غالب

شاید یہ آنا اس لئے تھا کہ میرے پاس صبر نہ آئے۔ عمر بھر چین نصیب نہ ہو

آنا تو خفا آنا جانا تو رُلا جانا　　آنا ہے تو کیا آنا جانا ہے تو کیا جانا

غالباً یہ نوازش اس غرض سے تھی کہ میری باقی زندگی تپش و کاہش میں گزُرے۔

التفات یار تھا اک خواب آغاز وفا　　سچ ہُوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

اِس رسم کا مقصد تو نگاہِ کرم جانے بہر حال میں نے جو کچھ دیکھا بیداری میں دیکھا۔ خواب نہ تھا کہ بھُول جاؤں۔ خیال نہ تھا کہ فراموش کردوں

اسد زندانی تاثیر اُلفت ہائے خُوباں ہُوں
خم دستِ نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

اِس مُلاقات (اگر اس کو مُلاقات کہنا صحیح ہے) کے بعد طبیعت پر ایک وحشت افزا ازخود رفتگی ایک اضطراب آمیز ربودگی سی مسلط رہی۔ اور اس کا سبب بھی معلوم نہ ہُوا۔

کیا مَیں کوئی چیز ڈھونڈ رہا ہوں۔ کسی شئے کی تلاش میں ہوں۔ ایک طلبگار جو مطلوب سے ناواقف ہو۔ ایک مسافر جو اپنی منزل مقصود نہ جانتا ہو

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے　　سینہ جویائے زخم کاری ہے
دل ہوائے خرام ناز سے پھر　　محشرستانِ بے قراری ہے

طبیعت بے کیف۔ دل بجھا بجھا کہتا ہوں۔ مرزا تجھے سودا ہے کسی کا خرام ناز خوابیدہ فتنوں کو بیدار کرتا رہے تجھے کیا۔ تیرا نصیب تو سو رہا

ہے ۔ کسی کی مسیحا نفسی نقشِ دیوار میں جان ڈالتی رہے میری طبیعت تو بدستور افسردہ ہے ۔

ابن مریم ہُوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

سکوں مقصود قرار نابود ۔ نالۂ شرربار، گریۂ بے اختیار
من خیالِ تو شبہا و کنجِ خانۂ خویش   سرودِ بے خودی و آہِ عاشقانۂ خویش
زندگی عجیب ہنجار سے گذر رہی ہے ۔ کبھی یاس تپش دل کو خانماں سوز بتاتی ہے کبھی محبت اس جلن کو امید کی آخری کرن ٹھہراتی ہے ۔

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں
غالب

پہلے مکتوب کا جواب

اسد مرزا!

آپ کا نوشتہ جو بے بنیاد شکایتوں کا طومار اور بے حقیقت حکایتوں کا دفتر تھا ملا شکایتوں سے حیرانی اور حکایتوں سے پریشانی ہے۔ حیرانی اس وجہ سے کہ آخر یہ شکائتیں کیوں کی جا رہی ہیں؟ پریشانی اس اندیشہ کی بنا پر کہ جب کچھ بات نہ ہونے پر "ملاقات" اور "دیدار" کے یہ رنگین افسانے گھڑے جا رہے ہیں تو آپ کی داستان طرازی آئندہ ضرور گل کھلائیگی یہ ایک پرانی مثل ہے کہ مردہ ہرچند اس کے سر پر قیامت ہی کیوں نہ ہو اول تو چپ سادھے پڑا رہتا ہے ...... نہ منہ سے بولے نہ سر کھیلے اور جب بولتا ہے تو کفن پھاڑ کر ... سو آپ نے شیطان کی آنت پر خط لکھ کر یہ مثل سچ کر دکھائی۔ ہو سکتا ہے کہ آپ نے آتے جاتے مجھے کسی جگہ دیکھا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ سرِ راہ مجھے بھی آپ کی سرسری زیارت کا اچٹتا سا شرف حاصل ہوا ہو۔ لیکن آپ نے صرف اتنی سی بات کو بڑھا کر افسانہ کر دیا بھتیجے نے "بوستان خیال" لکھی تھی! چچا نے داستانِ خیال لکھ ماری اور

داستان بھی وہ کہ اس کے آگے طلسم ہوشربا چڑیا چڑے کی کہانی معلوم ہوتی ہے قصہ بھی وہ جس کا آغاز انجام سے بے نیاز اور انجام آغاز سے بیگانہ ہے۔ سنا تو یہ تھا کہ راویان صداقت شعار اصل قصہ میں زیب کلام کے لئے کچھ بڑھا دیا کرتے ہیں۔ مشہور تو یہ تھا کہ بات کا بتنگڑ بنانے والے رائی کا پربت بنا دیا کرتے ہیں۔ لیکن آپ نے اس کام نہاد "معاملہ" کو جو صورت شناسی کی حد تک بھی نہیں پہنچا زورِ قلم سے ایک طرف گریبانِ ن اور دوسری طرف دامنِ صحرائے نجد سے ملا دیا ع

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

مضمون آفرینی کا شوقِ ترقی کے مرحلے طے کرتے کرتے اس مقام میں پہنچا کہ آپ نہ صرف بات میں سے بات نکالنے لگے بلکہ خاموشی کو بھی گفتگو کے سانچے میں ڈھالنے لگے ع خاموشی سے ہی نکلے ہے جو بات چاہیئے۔

سُبحان اللہ کیا افسانہ ہے کہ اس کی اٹھان نے طوفان نوحؑ کے جوش اور صرصر عاد کے خروش کو گرد کر دیا۔ مرحبا کیا ذوق ایجاد ہے کہ آپ کا خیال پلک مارتے ان تمام مرحلوں سے گزر گیا جو قیس و فرہاد نے برسوں خاک چھان کر طے کئے تھے۔ حسرت دید۔ ۔ ۔ ۔ ۔

نظارہ۔ نگاہ شوق کا بکھر جانا التفاتِ ناز پر طبیعت کا آنا

خم دست نوازش کا طوق بن کر گلوگیر ہونا اور دردِ عشق کا لاوا ابنجانا یہ سب کچھ ایک سانس کے وقفہ میں ہو گیا۔ آپ نے سچ مچ ہتھیلی پر سرسوں جما کر دکھا دی۔ وہ کیفیت جسے آپ ابتدا میں مرنا۔ اور انتہا میں

"زیست کا فرہ جانا کہتے ہیں۔ جنگل کی آگ کی طرح دیکھتے ہی دیکھتے۔ تمام خشک وتر کو جلا گئی اور آپ ببول کے سرد ہونے سے پہلے اس جاگیر سوختہ کے قانونی وارث بن گئے "

کوئی بات اس سے زیادہ بعید از قیاس وفہم نہیں ہوسکتی کہ ایک بھلا چنگا آدمی اس طرح کی مجذوبانہ باتیں کرنے لگے۔ خاک روانی کی صفت پیدا کرلے اور آگ فرمانروگی میں خاکسار بن جائے۔ آپکی باتوں کو مبالغہ سے پاک فرض کر لیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موکلین عذاب نے دوزخیوں کی چیخ پکار سے متاثر ہوکر ایک کھڑکی آپ کے سینہ میں کھولدی ہے کہ اس طرح جہنّم کی آگ کی تیزی کچھ کم ہوجائے۔ یا کسی نانبائی نے آپ کے سینہ کو جائے لاوارث سمجھ کر بے حصول اجازت تنور بنا لیا ہے؟

آپ بظاہر ان دنوں فکر معاش وغم صیّاد سے آزاد سراپا محشر اضطراب اور فانوس خیال بنے ہوئے ہیں اسی گردش بے مقصد میں کبھی آپ کا سینہ زخم دامن دار طلب کرتا ہے اور کبھی دل کی حرکت خون کا دباؤ پڑنے سے تیز ہوجاتی ہے۔ اگر آپ کے بقول زندگی کا لطف اسی میں ہے تو خدا کرے آپ صدیوں یہ مزا حاصل کرتے اور درد لا دوا کی رُوح افزا لذّت اُٹھاتے رہیں۔ کسی خدا کی سنوار ہے جو آپ کو اس خیالی عیش سے محروم کرے کس کی سمجھ پر پتھر پڑے ہیں جو آپ سے یہ فرضی مزا چھین لینے کا ارادہ کرے آپ کے خط میں بلحاظ معنویت بعض مقامات ایسے تھے کہ "آگہی" نے ہر چند "دام شنیدن" بچھایا لیکن

مدعا جو عالم تحریر کا عنقا تھا ہاتھ نہ آیا۔ اور یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آپ نے کس لئے اپنی اُنگلیوں کو فگار اور خامہ کو خونچکاں کیا ہے۔ اگر خط لکھنے سے مقصود اس نعمت غیر مترقبہ (لذّت درد لا دوا) کا اظہار تھا جو آپ کو بے طلب مل گئی ۔ تو یہ حاصل ہو گیا۔ مبارک باشد۔ اگر اس کے سوا کوئی اور مطلب تھا تو اس کے سمجھنے سے بصد ندامت معذوری ظاہر کی جاتی ہے ع

جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

آپ کے گول مول الفاظ سے مطلب نکالنا عنبر کے لئے سمندر بلونا اور جے شیبہ کے لئے پہاڑ توڑنا ہے۔ آپ سیدھی سادی بات کو بھی ایسے ایچ پیچ سے کہتے ہیں کہ قوّت فہم ششدر رہ جاتی ہے مقصود نگارش معلوم کرنے میں سخت دشواری پیش آتی ہے کہیں کنایہ در کنایہ کہیں استعارہ در استعارہ۔ کہیں تشبیہ کہیں تمیح ۔ کہیں تعریف سے تنقیص مراد کہیں قدح سے مدح مقصود۔ معمولی سی خراش آجائے تو اس کے اظہار کے لئے اسلحہ خانہ کے تمام ہتھیاروں کے نام اور مطلب دُور کرنے کے لئے فنِ حرب کی اصطلاحوں سے کام لینا معمولی سی تحیر میں ہستی کے تصوّر اور خودی کے احساس کو دردِ سر کہنا۔ حقیقت کے اظہار میں ہمیشہ حقیقت سے دُور دُور رہنا۔ سردی میں چھت پر جا کے دھوپ کھانے کو جی چاہا تنگ و تاریک کوٹھری میں پڑے پڑے جی اکتایا۔ لیکن زینہ موجود نہ ہونے کے باعث اوپر نہ جا سکے یہ واقعہ ایسا نہیں کہ دُنیا میں

کسی غریب کرایہ دار کو پیش نہ آیا ہو لیکن آپ نے اس کو براہ تکلّف ان الفاظ میں بیان فرمایا

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاش آشیاں اپنا

مضمون کی حقیقت تو صرف یہ ہے کہ آپ سیڑھیاں نہ ہونے کی وجہ سے مکان کی چھت پر نہ جا سکے لیکن مجاز سے ظاہر ہوتا ہے کہ بلندی ہمّت آپ کو اس تیرہ اور تنگ خاکداں (ذوق۔ بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا تو یہ بھی اس کی فروتنی ہے۔ اسد مرزا۔ کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے) میں نچلا نہیں بیٹھنے دیتی۔ آپ کی رُوح شوق سیر میں طائرہ خیال کے ساتھ آسمانوں سے گذرتی اور اس بے نیابت راہ کو کمال جُرأت و ہمّت سے طے کرتی چلی جاتی ہے نہ میدان مرتفع میں ٹھہرتی ہے نہ کسی پہاڑ کی بلند چوٹی پر (عطارؔ۔ دررہ رُوح پست و بالا ہاست + کوہہائے بلند و صحرا ہاست) قیام کرتی ہے قمر، مُشتری۔ مریخ۔ زحل سب پیچھے رہ جاتے ہیں کائنات انجم کی حد آجاتی ہے لیکن یہ سیاحت لاہوت کے جذبہ بے اختیار میں بڑھی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ عرش کے کنگروں میں طائر خیال کے ساتھ آشیاں بناتی ہے۔ اس بلند مقام سے زمین اور آسمان کی ہر ایک چیز پر طائرانہ نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ نُور و ظلمت ایک قندیل میں گردش کرتے نظر آتے ہیں لیکن مرزا اسد ہیں کہ اپنی بلند نگاہی کی بدولت یہاں بھی مطمئن نہیں۔ جی یہی

چاہتا ہے کہ بلند تر مقام پر بیٹھ کر عرش کا نظارہ اسی طرح کرتے جس طرح یہاں سے فرش کو دیکھ رہے ہیں۔

چونکہ آپ مضمون آفرینی اور بلند پروازی کے دُھن میں واقعیت سے دُور چلے گئے ہیں اس لئے جب تک خود اپنے مطلب کو سادہ طور سے بیان نہ کریں۔ اس کا سمجھنا آپ ہی کا کام ہے یہاں کسی کو کشف و روشن ضمیری کا دعویٰ نہیں کہ لوگوں کے دل کی بات معلوم کرلے۔

خطوط کے متعلق صرف اتنا عرض کردینا کافی ہے کہ شائستہ التفات ہونے کی صُورت میں جہاں تک ممکن ہوگا بروقت جواب لکھنے کی کوشش کی جائیگی ؎

"ستمگر"

دوسرا مکتوب

سُن اے غارتگر جنسِ وفا سُن
شکستِ شیشۂ دل کی صدا کیا

جانِ غالب!

بیمار نے طبیب مہربان سے کہا کہ میرا سینۂ سوزِ نہاں سے جلوہ زار آتشِ دوزخ بنا ہوا ہے۔ ہر ایک نفس گرم بھڑکتا ہوا شعلہ ہے۔ دِل پھُنکا جاتا ہے رختِ حیات جل رہا ہے۔ ع۔ اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی۔ شمع زندگانی بھڑک رہی ہے۔ دل میں چھالے ہیں۔ زبان پر تب خالے۔

طبیب نے تمام حال سُننے کے بعد نہایت سادگی سے کہا۔

معاف کیجئے۔ آپ کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا آپ سلیس ریختہ میں اس کو واضح کرنے کی تکلیف گوارا کرینگے؟

رات بھر بیمار کی کراہ سُننے کے بعد صُبح کے وقت کیسے بھولے پن سے یہ پُوچھا جا رہا ہے "نصیب اعدا آپ کی طبیعت کچھ ناساز ہے"؟ آپ کچھ نہیں جانتے آپ کو کچھ معلوم نہیں"۔

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا
کہاں تک لے سراپا ناز کیا کیا

مَیں کس وجہ سے طاؤسِ آتش باز کی طرح جل رہا ہوں۔ کیا کہوں۔ جو سمجھنا ہی نہ چاہے اسے کیوں کر سمجھاؤں۔ انجان کو دل کا حال جتانے کے لئے کیا جتن کروں۔ وائے نصیب میری بات کو چیستان بنا لیا۔ مکتوبِ شوق وہاں تک پہنچتے پہنچتے ایک عُقدہ و دُشوار بن گیا اِس بزم تک میری فریاد گئی لیکن نغمہ بن کر۔ میری آہ اُن کے کانوں تک پہنچی لیکن داستانِ خواب آور کے رنگ میں۔ ع

حرفِ مطلب کو اُڑانا کوئی تم سے سیکھ جائے

آپ کی سمجھ میں میرا مطلب کس طرح آتا مَیں خود بار بار سوچتا ہوں کہ میرا مطلب اس خط سے کیا تھا؟ وہ خط کیوں بھیجا۔ شکوۂ تغافل کیوں کیا؟ لیکن اِس مُدّعا فراموشی کے باوجود کچھ ہوش باقی ہے حسن کی بے التفاتی سے رُوح اذیّت پاتی ہے انجان بننے کی ادا پسند نہیں آتی ہے۔ یہ رسمی کرم میرے حق میں ستم ہے اور ستم عام بدترین جفا۔ مَیں بجلی کو بادل اور دمِ شمشیر کو سینۂ شمشیر سے باہر دیکھنا پسند کرتا ہوں

نگاہِ بے حجابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

تیر چلاؤ تو بے خوف ہو کر۔ تیغ آزماؤ تو بیباکی سے۔ خرمن صبر و قرار پر

برق گرتی ہے تو ایک بار گر پڑے آگ میرے گھر کو جلانا چاہتی ہے تو بھڑک بھڑک کر دب نہ جائے اگر اس تغافل سے طاقت صبر کا جائزہ لینا مقصود ہے تو نازبے فائدہ یہ زحمت اُٹھاتا ہے میں تو یہ کہتا ہوں

؎ تیر پر تیر لگاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے ؟

قطرۂ شبنم کی یہ مجال کہ مہر درخشاں کے مقابل آئے سایہ کی یہ ہمت کہ نور کا حریف بنے

کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ
شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا ؟

آپ کی خوش فہمی کی کوئی حد نہ شگرف خیالی کی کوئی انتہا۔ میں نے یہ کب کہا کہ چلتا پھرتا جیتا جاگتا جہنم بن گیا ہوں یا میرا سینہ خس و خاشاک ہوس کے دھوئیں سے نانبائی کا تنور بن گیا ہے

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی
فتنۂ شورِ قیامت کس کے آب و گل میں ہے

یہ باور کرنا مشکل ہے کہ میرا مطلب سمجھا نہیں گیا۔ یہ تصور کرنا دشوار ہے کہ نقش مدعا خاطر نشین نہیں ہوا۔ میں نے سینہ کی جاں سوز گرمی کو آتش ی کہ آپ نے اسی جرم میں مجھے بولتا چالتا جہنم بنا دیا۔

دل میں چٹکیاں لے کر درد پیدا کیا اور اسے چٹکیوں میں اُڑا دیا۔ سچ تو ہے آپ نہ سوز کے راز سے واقف نہ طلب کے ساز سے آگاہ۔ کسی کے خانہ خس پوش میں آگ لگا کر ہٹ جانا اور اس بات کا خیال رکھنا کہ

یہ خاکستر ہوئے بغیر نہ رہے۔ اور ہم پر آنچ نہ آئے۔
حسنِ معصوم کے سوا یہ احتیاط کون کر سکتا ہے؟

سادگی و پُرکاری بیخودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

آپنے پُوچھا تو میں نے اپنا حال بیان کیا

جب کرم رُخصت بے باکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

آپ فرمائینگے کیا حال ہے؟ کہونگا وہی رنج و ملال ہے۔ لیکن یہ تو فرمائیے یہ پُرسش و اظہار مدعا کا سلسلہ کہاں تک طول کھنچیگا۔ یہ حالت اُمید و بیم اور سعی افہام و تفہیم کب تک جاری رہے گی۔

بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائینگے کیا

خیر ع عمرت دراز باد کہ ایں ہم غنیمت است

گو نہ سمجھوں اس کی باتیں۔ گو نہ پاؤں اُسکا بھید۔
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھُلا
غالب

تیسرا مکتوب

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

جانِ غالب!

خورشید دل شبنم کے اضطراب سے متاثر نہ ہوا۔ صبح عید نے غریب کی آنسو بھری آنکھ کو شایانِ التفات نہ سمجھا۔ دوادر و کی طرف متوجہ نہ ہوئی۔ نوازش کے وعدوں کی مسرت جلوۂ سیمیا کی طرح آنکھوں سے اوجھل ہونے لگی نیاز نامہ درخورِ جواب نہ سمجھا گیا

حیف اُس پارۂ قرطاس کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو مکتوب پریشاں ہونا

غرورِ حسن کے نیم کرشمہ نے اُس ہوائی قلعہ کو طرفۃ العین میں مسمار کر دیا جو نازِ نیاز مندی نے بنایا تھا۔ استغنا کے ایک اندازِ جانستاں نے وہ دیگ اُلٹ دی جس میں تمنّا نے خیالی پلاؤ پکایا تھا۔ محبّت رات بھر ایک دلچسپ کہانی سُناتی رہی۔ لیکن آفتاب نے نمودار ہوتے ہی اس کی حقیقت ظاہر کر دی۔ تغافل نے ہنگامی تپاک کی پیدا کی ہوئی توقعات کا تار و پود

بکھیر دیا۔ حسن کے دماغ نے پھر عشق کے دل پر فتح پائی۔ محبت اختیار کو جبر اور جبر کو اختیار بنانے میں پھر ناکام رہی۔ اب امید مچلتے ہوئے دل کو اپنے رنگین کھلونوں سے بہلانے اور صبر گریز پا کو یہ کہہ کر ٹھہرانے کی کوشش کر رہی ہے۔ ع کشتنے کہ عشق دارد نہ گذاردش بدنیاں۔ اس کے نزدیک محبت کی تاثیر کا بروئے کار آنا ایسا ہی یقینی ہے جیسا موسم سرما کے بعد بہار کا جلوہ گستر ہونا۔ اس کی دانست میں دلِ سوزناک کی تپش جذب کی وہی طاقت رکھتی ہے جو فضائے بسیط میں سیاروں کو محور سے دور نہیں جانے دیتی۔ میں ایک طرف امید کی خیال آرائی سے شرار بہ دل ہوں اور دوسری طرف محبت کی حوصلہ افزائی سے آتش بہ جگر۔

خزاں جائیگی بہار آئیگی میں اس پر ایمان بالغیب رکھتا ہوں۔ مجھے یقین کامل ہے کہ بہار بہار چلے گی اور اس کی راہ میں نکہت گل عنبر بکھیرے گی۔ عروس چمن آراستہ ہو گی اور شبنم اس کے دامن و گریباں میں گہر ہائے شاہوار ٹانکے گی۔ شگوفے کھلیں گے۔ فضا شکریہ بہار کے گیتوں سے معمور رہو گی لیکن

پیاسی کھیتی چند ہی روز بارش کا انتظار کر سکتی ہے۔ مریض جاں بلب بمشکل ایک لمحہ کسی کا منتظر رہ سکتا ہے۔

ابر باراں کی دُر افشانی اور دریا دلی یقینی لیکن اس کے مائل بذل و نوال ہونے اور حاصل بحر لٹانے تک مرجھائے ہوئے سبزہ کا زرد پتہ خاک میں مل چکا ہو گا۔ اد بہار کے چلنے اور معتدل ہوا کے معجز نما ہونے تک یہ مشت خاکِ پریشان

پریشان ہو چکی ہوگی۔ طبیب مہرباں کے پہنچنے تک دم توڑنے والے مریض کی رُوح جنت کے حیات افروز آبشاروں یا جہنم کے جہاں سوز شعلہ زاروں میں پہنچ جائیگی۔ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ اس دارِ وفات میں شمع ضرور اپنے کئے کو پہنچیگی لیکن صبح تک محفل میں یہاں پروانہ کی خاک بھی ڈھونڈے نہ ملے گی۔ بارش کی جھڑی سنگ خارا پر اثر کرے گی لیکن اس وقت جب پہلی بُوند کے ٹکڑے ہوا میں نابُود ہو جائیں گے۔

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک

کبھی یہ خیال آتا ہے کہ ممکن ہے جواب لکھا ہوا ور لفافہ پر سہواً "گلی ہاشم خاں" تحریر کردیا ہو۔ کبھی یہ گمُاں ہوتا ہے کہ شاید انہیں یہ خیال بھی نہ ہو کہ غالب کوئی .... تھا۔ اگر سوءِ اتفاق سے پتہ لکھنے میں کوئی تسامح ہوا ہو تو یاد رکھئے غالب جس گلی میں رہتا ہے۔ اس کا نام گلی قاسم جان ہے۔ "گلی قسم جان" یا "قسم جن" نہیں۔ اگر خدانخواستہ باشد مجھے فرضِ محبت کی طرح فراموش کردیا گیا ہے تو صرف اتنا عرض کرونگا

تُو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دُوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

یہ انقلاب یکایک کس طرح ہو گیا؟ یہ موجِ کرم آتے آتے کیوں پلٹ گئی؟

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
کل تلک تیرا ہی دل مہر و وفا کا باب تھا

صید دامِ اُفتادہ ہوں مجھ سے کم خوردگی کیوں؟ بستۂ فتراک ہوں مجھ سے پرہیز کس لئے؟

یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا

آہ کیا یہ صیدِ زبوں اس لائق بھی نہیں کہ اس کا خُون تھوڑی دیر کے لئے کسی کے ہاتھ کو حنا سے بے نیاز کر دے یا اس کی گردن پر تُرسِ تیغ جفا کی آزمائش کی جائے

ان شکارم من کہ ہم لائق بکشتن نیستم شرم می آید مرا زانکس کہ صیادِ من است

پچھلے خط میں جواب لکھنے کے متعلق کوئی صاف و صریح وعدہ نہ تھا لیکن میں نے یہ کہہ کر شکایتوں کا قصہ کوتاہ کر دیا

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کش گلبانگِ تسلّی نہ ہوا

اس وقت خیال بھی نہ تھا کہ یہ التفات تمہیدِ تغافل بنے گا۔ اور دوسرے نیاز نامہ کے جواب میں خاموشی اختیار کر لی جائیگی۔ کبھی یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ شاید کوئی بات ناگوار گذری اور وہ خیر اندیشی یکایک بد خواہی میں تبدیل ہو گئی۔ اس اندیشہ کو یہ کہہ کر دفع کرتا ہوں

ہے ہے۔ خدانخواستہ وہ اور دُشمنی
اے شوق منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے؟

سُنئے صاحب ساری باتیں اچھی ہیں لیکن یہ چُپ شاہ کا روزہ رکھنے کی۔۔۔۔ خدا نے قوّت گویائی اِس لئے دی ہے کہ انسان اپنے تاثرات سے دُوسروں کو آگاہ کر سکے آدمی اس بنا پر پھول سے اچھا ہے کہ پھُول کئی زبانیں رکھنے کے

نہیں بولتا اور آدمی ایک زبان سے کئی زبانوں میں داستاں سرائی کرتا ہے۔ اگر ایک شخص مرمریں مجسمہ کی طرح چپ رہتا ہے اور دوسرا حال دل کہتا رہے تو اس گفت و شنید میں کیا لطف؟

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

بہرحال ـــــ قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

اس لئے کہ عداوت بھی ایک طرح کا تعلق ہے اور اس صورت میں اربابِ نظر بایں خیال دل کو تسلی دے سکتے ہیں کہ گو دشمنی سے دیکھتے ہیں دیکھتے تو ہیں شکرِ خدا کہ ہیں تو کسی کی نگاہ میں اگر یہ خاموشی کسی غیر معمولی مصروفیت کے باعث ہے تو میں حیران ہو کر کاروبارِ تمنا سے بہتر شغل کیا ہو سکتا ہے۔ محبت سے خوشگوار تر مصروفیت کونسی ہے؟۔ اگر دنیا کے دھندے آپ کے ذہن کو الجھائے رہتے ہیں تو صرف ایک بار یہ حقیقت خاطر نشین کر لیجئے کہ ع دنیا ہیچ است و کارِ دنیا ہمہ ہیچ۔ محبت اس دنیا کے کھنڈروں سے دور اپنی الگ دنیا بسانا چاہتی ہے۔ نہیں۔ بلکہ محبت بجائے خود ایک دنیا ہے آباد و شاد۔ اس مادی جہاں سے ملی ہوئی اور اس کی ظلمتوں اور کدورتوں سے جدا۔ یاد آوری کے متعلق جو وعدہ فرمایا تھا اس پر اعتبار ہے۔ کرم نے خبر گیری کا جو یقین دلایا تھا اس سے اک گونہ تسلی ہے مانا کہ آئندہ تغافل نہ ہوگا ــــــ لیکن

ع خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

تیسرے مکتوب کا جواب

اسد مرزا!

آپ کے مایہ ناز فارسی کلام کی قسم آپ کا خط مدت مدید کے بعد ملا۔ سوگند اس لئے کھائی کہ یوں آپ اس امر واقع کو بہ مشکل تسلیم کرتے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خط دیر میں کیوں ملا۔ جب کہ فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا اور دستی خط شہر میں ہم روزہ ہی وصول ہو جاتے ہیں۔ قاصد کو تاکید بھی کر دی گئی تھی اور وہ کوئی نیا آدمی نہ تھا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ قاصد نے کافی مدت کے بعد ایک روز آکر یہ بیان کیا کہ مرزا جیو نے پرچہ دیا تھا پر وہ کہیں گر پڑا۔

میں نے کہا کمبخت۔ تجھے شامت نے گھیرا ہے۔ ارے یہ غضب کہ مرزا صاحب کا خط گم کر دیا۔ اور دو ہفتوں کے بعد یہ اطلاع دینے آیا ہے کہ وہ پرچہ کہیں گر پڑا۔ کیوں نہ تیرا سر کسی اینٹ یا پتھر سے ٹکرا کر ٹوٹا۔ تو ایسا ہی بے خبر تھا تو بلی ماروں سے نکل کر کیوں نہ سیدھا جہنم میں چلا گیا تیرے ہاتھ پانوں۔ آنکھ ناک اور کان سب سلامت ہیں تو نے اپنا بوجھ تو خوب سنبھالا ہاں نہ سنبھلا تو کاغذ کا ایک پرزہ جو تیرے کان سے چھوٹا اور جان سے ہلکا تھا۔ جا میرے

سامنے سے ٹل جا اور اُس خط کو کہیں سے پیدا کر کے لا۔ اگر وہ زمین کے ساتویں طبقے میں پہنچ گیا ہے تو تُو بھی سُرنگ کھود کر وہیں پہنچ اور اسے نکال.... اگر وہ اُڑ کر آسمان پر پہنچ گیا ہے تو تُو بھی پَر پرواز پیدا کر اور اُسے ڈھونڈ کر زمین پر لا، قاصد کو خوب گرم کیا تو وہ گیا اور ایک روز کے بعد آپ کا خط لا کر دیا۔ لیکن اِن تین ہفتوں میں اس نے فرسودگی اور خرابی کے کئی مرحلے طے کر لئے تھے۔ اور منزل فنا کے قریب پہنچ گیا تھا دریدہ۔ بوسیدہ۔ باسی ہاروں کی طرح ملا دلا۔ رنگ اُڑا ہُوا۔ رُوپ بدلا ہُوا حروف آپس میں گتھم گتھا۔ الفاظ باہم دست و گریبان۔ سیاہی سوادِ شام کی طرح پھیلی۔ کاغذ کی رنگت کہیں اُجلی کہیں میلی۔

خط دیکھ کر میں نے کہا نیکبخت کیا تو نے بمصداق نیکی کر اور دریا میں ڈال مرزا صاحب کے مکتوب کو دریا بُرد کر دیا تھا۔ یا تو شدار و لو ہی سمجھ کر نگلنے کی کوشش کی تھی۔ قاصد نے بتایا یہ خط بھینس کو پانی پلانے کی ناند میں گر پڑا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے نکال کر خشک ہونے کے لئے چھت پر رکھ دیا۔ یہ تھا آپ کے خط کے غُسل صحت کا قصہ دیدے پھُوٹیں اگر اس سے پہلے ایک سو آپ کا دُوسرا خط دیکھا ہو۔ ہاتھ ٹوٹیں اگر آج سے پیشتر آپ کے دُوسرے خط کو چھُوا ہو۔ خیر یہ بھی غنیمت ہے کہ آپ کا خط ڈُوبتا اُچھلتا بقا در فنا کے خطرناک مرحلوں سے گذرتا آخر کار منزل مقصود پر پہنچ تو گیا۔

خط کی مشکل تو خدا خدا کر کے آسان ہو گئی۔ لیکن اب مجھے اس کے ماننے میں دُشواری پیش آئی حروف کے تیور بگڑے ہوئے۔ نوک پلک سے غضب کے

آثار نمودار۔ کچھ بھرے ہوئے اُلجھنے کے لئے آمادہ اور کچھ مصروف کشمکش۔ اِس خط کو پڑھنے میں بصارت اور بصیرت دونوں کو انتہائی محنت سے کام کرنا پڑا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مصر کے کسی قدیم تہ خانے سے عہد فراعنہ کا کوئی کتبہ برآمد ہُوا ہے اور قدیم زبانوں میں مہارت کا آخری امتحان لینے کے لئے اسے میرے پاس بھیج دیا گیا ہے۔ سخن فہمی کی تمام صلاحیتیں جمع کر کے سیاق و سباق کی روشنی قیاس کی عینک اور خوردبین گمان کی مدد سے ایک ایک لفظ بجے کر کے نکالا۔ اگرچہ یہ کام سخت دُشوار تھا لیکن معانی و مطالب کے اس طوفانی سمندر میں غوطے لگاتے وقت یہ اطمینان ضرور تھا کہ کوئی گوہر بے بہا ضرور ہاتھ آئیگا۔ بہر حال جس حد تک ممکن تھا سمجھنے کی کوشش کی۔

تغافل اور تجاہل کے متعلق آپ کی شکائتیں کچھ بے سروپا سی ہیں۔ بظاہر طبع غالب یاس سے مغلوب ہوگئی ہے۔ نظر ہر ایک معاملہ کے روشن پہلو کی بجائے تاریک پہلو پر جاتی ہے۔ آپ کے اِس خط سے بھی مرثیہ کی بُو آتی ہے۔

میرے اس وعدہ میں کہ آپ کے ہر ایک شایانِ التفات خط کا جواب بروقت لکھنے کی کوشش کی جائیگی آپ کی بہت سی شکایتوں کا جواب موجود تھا لیکن مشکل یہ ہے کہ جب کسی کو اپنی شکوہ سنجی میں مزا آنے لگتا ہے۔ تو وہ شکایتوں کے جواب پر زیادہ غور نہیں کیا کرتا۔ یہی حال آپ کا ہے کہ شکایت شروع کر دیتے ہیں تو اسے ختم کرنا نہیں چاہتے۔

چوتھا مکتوب

ترے وعدہ پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

جانِ غالب !

دیوانہ بکارِ خویش ہوشیار تو سنا ہوگا اب اس کا مطلب بھی سن لیجئے۔ ہر ایک آدمی اپنے دل کو کسی نہ کسی طرح بہلا لیتا ہے کبھی دشت نوردی سے اور کبھی گریبان دری ہے۔ غالب دیوانہ بھی بہر طریق و بہر صورت اپنے وقت کو خوش گذارنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن آپ کی مہربانی کا خیال کبھی اس کے لئے موجب تسلی و تشفی نہیں ہوتا اور ہو بھی کیوں کر؟

اگر خزاں کو بہار۔ خارستان کو گلزار۔ دشت کو چمن۔ غربت کو وطن اور دودِ چراغ کشتہ کو بوئے سمن قرار دینا ممکن ہے اگر بیگانگی کو یگانگت۔ عداوت کو محبت۔ نفرت کو الفت سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر غم دوری کو مسرتِ حضوری اور فراق کو وصال فرض کیا جا سکتا ہے تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں اس بے تعلقی کو تعلق کہوں اور بے ربطی کو ربط کے نام سے موسوم کروں۔ خیال یہ کر سکتا ہے کہ معمولی توجہ پر تعلق خاطر کا دلکش رنگ پھیر دے۔